30

دعا کرنے سے پہلے سوچنا چاہئے کہ میری کیا کیا ضرورتیں ہیں

(فرمودہ 23 اگست 1946ء بمقام ڈلہوزی)

تشہد، تعوّذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

"اب رمضان کا مہینہ ختم ہو رہا ہے۔ آج پچیسواں روزہ ہے۔ اگر رمضان تیس دن کا ہوا تو پانچ دن اور اگر اُنتیس دن کا ہوا تو چار دن باقی ہیں۔ بہرحال اگلے جمعہ سے پہلے پہلے رمضان ختم ہو جائے گا اور جو برکات اس سے وابستہ ہیں وہ بھی ایک سال تک عام طور پر لوگوں سے چُھٹ جائیں گی۔ ایک متقی انسان کے لئے تو ہر دن ہی رمضان کا دن ہے اور ہر مہینہ ہی رمضان کا مہینہ ہے اور ہر رات ہی اپنے اندر لَیْلَۃُ الْقَدْر کی برکات کو لئے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کو لَیْلَۃُ الْقَدْر قرار دیا ہے اور آپ کے لئے ہر دن لَیْلَۃُ الْقَدْر تھا اور ہر رات لَیْلَۃُ الْقَدْر تھی اور ہر صبح لَیْلَۃُ الْقَدْر تھی اور ہر شام لَیْلَۃُ الْقَدْر تھی۔ لیکن کیا ہر انسان اس مقام کا ہو سکتا ہے جس مقام پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے؟ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دوسرا انسان اس مقام کا ہو ہی کہاں سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ [1] کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! اگر تیری پیدائش میرے مدنظر نہ ہوتی تو مَیں افلاک کو ہی پیدا نہ کرتا۔ گویا اَفلاک کی خَلق کا مقصد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے۔ پس آپ کے بعد یہ سمجھنا کہ آپ جیسا سلوک کسی اَور شخص سے بھی ہو سکتا ہے

بالکل حماقت اور بے وقوفی کی بات ہے۔ ہر انسان سے اللہ تعالیٰ کا الگ الگ سلوک ہوتا ہے۔ عام دنیا کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک رمضان مقرر کیا ہے کہ تم میرے لئے روزے رکھو، بھوک پیاس کو برداشت کرو، جذبات پر ہر رنگ میں ضبط رکھو۔ جب تم یہ قربانی کرو گے تو میری طرف سے تمہارے ساتھ یہ سلوک ہو گا کہ مَیں تمہارے لئے آسمان سے اُتروں گا اور تمہاری دعاؤں اور التجاؤں کو سنوں گا اور تمہارے لئے اپنی خوشنودی کے رستے کھول دوں گا۔ پس جب عام لوگوں کے لئے یہ مہینہ گزر جائے گا تو اس کی برکات بھی ان سے رخصت ہو جائیں گی۔ اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اِس مہینہ کی برکات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اس کو حاصل ہو جائے۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے روزے نہ رکھے یا وہ لوگ جن کے روزے ضائع ہو گئے ان کے لئے رمضان کا آنا اور نہ آنا دونوں برابر ہیں۔ کیونکہ اگر ایک شخص روزہ رکھنے کے بعد روزہ کی شرائط کو ملحوظ نہیں رکھتا یعنی زبان کو جھوٹ اور فریب سے، آنکھوں کو بدنظری سے، کانوں کو بُری باتوں کے سننے سے نہیں بچاتا۔ رسول کریم ﷺ ایسے شخص کے متعلق فرماتے ہیں کہ ایسا شخص بھوکا تو بے شک رہا لیکن اس نے روزہ نہیں رکھا کیونکہ اس نے روزہ کی شرائط کو پورا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ کو اس بات کی ضرورت نہیں کہ کوئی شخص بھوکا رہے یا روٹی کھائے۔2 کسی کے روٹی کھانے سے اللہ تعالیٰ کو نقصان کیا ہے اور نہ کھانے سے کیا فائدہ ہے؟ اس میں تو سراسر انسان کا فائدہ ہے۔

علاوہ اَور اغراض کے روزہ کی ایک بڑی غرض یہ بھی ہے کہ انسان کو غریبوں اور مسکینوں کی تکلیف کا احساس ہو اور اسے محسوس ہو جائے کہ میرے غریب بھائی کس طرح تکلیف سے دن بسر کرتے ہیں۔ لیکن اگر اسے اس بات کا احساس نہیں ہوتا تو وہ شخص روزہ کی حقیقت سے بالکل ناآشنا ہے کیونکہ جس غرض کے لئے اللہ تعالیٰ نے روزہ مقرر کیا ہے اسے اس نے نظر انداز کر دیا اور اس کے صرف بھوکا رہنے سے اللہ تعالیٰ کو کیا فائدہ ہے۔ اسلام کے تمام احکام ایسے ہیں کہ ان کے اندر انسان کے لئے صدہا فوائد ہیں۔ پس ہمارا روزے رکھنا اللہ تعالیٰ پر احسان نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر احسان ہے کہ اس نے ہمیں روزہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ منافق لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ہم نے اسلام کو قبول کر کے اسلام پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتا ہے کہ تُو ان کو کہہ دے کہ تم مجھ پر احسان نہ رکھو۔ تمہارا مجھ پر کوئی احسان نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں اسلام قبول کرنے کی توفیق بخشی۔3 اسلامی شریعت باقی شریعتوں کی طرح چٹی نہیں بلکہ اس پر عمل کرنے میں انسان کا خود اپنا ہی فائدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی انفرادی یا اجتماعی حکم مسلمانوں کو ایسا نہیں دیا جو بے فائدہ ہو اور غور کرنے سے اس کے فوائد نظر نہ آتے ہوں۔ اسلامی شریعت کے تمام کے تمام احکام ایسے ہیں جو بنی نوع انسان کی بہبودی اور بہتری کے لئے ہیں۔ توحید ہے تو اُس کا فائدہ لَوٹ کر انسانوں کو پہنچتا ہے۔ صفاتِ الٰہیہ کا علم ہے تو اُن کا فائدہ لَوٹ کر انسانوں کو پہنچتا ہے۔ نماز ہے تو اُس کا فائدہ لَوٹ کر انسانوں کو پہنچتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نماز کے متعلق فرماتا ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ4 کہ نماز بدی اور بے حیائی کی باتوں سے روکتی ہے۔ اگر ایک انسان بدنامی اور ذلت سے بچ جائے تو اس میں اللہ تعالیٰ کا فائدہ ہے یا بندے کا؟ اگر انسان فساد اور خون خرابہ سے بچ جائے تو اس میں اللہ تعالیٰ کا فائدہ ہے یا بندے کا؟ اگر انسان غدار کہلانے سے بچ جائے تو اس میں اللہ تعالیٰ کا فائدہ ہے یا بندے کا؟ اگر انسان ماریں کھانے اور جیل جانے سے بچ جائے تو اس میں اللہ تعالیٰ کا فائدہ ہے یا بندے کا؟ اسی طرح روزے رکھنے سے بھی انسان کا اپنا فائدہ ہے کہ اس کے دل میں روزے کی وجہ سے تقویٰ پیدا ہو اور وہ دُنیوی و اُخروی عذابوں اور مصیبتوں سے بچ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے روزے کی غرض و غایت یہی بیان کی ہے لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ5 تاکہ تم بچ جاؤ۔ یعنی برائیوں اور بے حیائی کی باتوں اور قسم قسم کی تکلیفوں سے بچ جاؤ۔ مثلاً جیسا کہ مَیں بیان کر آیا ہوں کہ اگر روزہ نہ ہوتا تو امراء اور آسودہ حال لوگ غرباء کے فاقوں کی تکلیف کو محسوس نہ کرسکتے اور نہ ہی ان کی امداد کے لئے ان کے دلوں میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا۔ اور غرباء اپنی جگہ تکلیف میں رہتے اور امراء ان کی امداد نہ کرنے کی وجہ سے ثواب سے محروم ہو جاتے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مورِد بنتے۔ لیکن اب جب ایک امیر روزہ رکھتا ہے اور اسے بھوک اور پیاس کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے تو وہ یہ سوچتا ہے کہ باوجود اس کے کہ مجھے دو وقت کھانا ملتا ہے لیکن صرف آگے پیچھے کر دینے کی وجہ سے مجھے اس قدر تکلیف ہوئی ہے۔ اگر اس میں ذرہ بھر بھی احساس باقی ہے۔ اگر اس میں ذرہ بھر بھی شرم و حیا

باقی ہے تو وہ اس احساس کے پیدا ہوتے ہی فوراً اِس بات پر بھی غور کرے گا کہ ان غرباء کی کیا حالت ہوتی ہو گی جن کو کئی کئی دن فاقے آتے ہیں۔ جب وہ یہ سوچے گا تو یقیناً اُس کے دل میں رحم کے جذبات موجزن ہوں گے اور وہ غرباء کی امداد کی فکر کرے گا۔

بڑے آدمیوں کے علاوہ رمضان کے ایام میں آٹھ دس سال کے بچے بھی اصرار کرتے ہیں کہ ہم بھی سحری کھائیں گے اور روزہ رکھیں گے۔ والدین بار بار منع کرتے ہیں کہ نہ بچہ! روزہ نہ رکھیو کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر اس عمر میں یہ روزہ رکھے گا تو اس کے اعضاء پر بُرا اثر پڑے گا اور اس کے اعضاء کمزور ہو جائیں گے۔ لیکن اگر ان میں شرم و حیا اور کوئی غیرت باقی ہے تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ غریبوں اور مسکینوں کے بچوں کی قوت اور نشو و نما کس طرح قائم رہ سکتی ہے جبکہ انہیں فاقے پر فاقے آتے ہیں۔ پس اِن اجتماعی روزوں میں یہ حکمت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو بچے میں نقل کا مادہ رکھا ہے جب وہ لوگوں کو روزے رکھتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ بھی نقل کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس طرح ماں باپ کو بچے کے فاقہ کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

سال بھر میں رمضان کے ایام کے علاوہ بھی بعض لوگ روزے رکھتے ہیں۔ لیکن بچے کبھی بھی روزہ رکھنے پر اصرار نہیں کرتے کیونکہ ان دنوں میں کوئی شان اور نمود نہیں۔ لیکن رمضان کے ایام میں بچے دیکھتے ہیں کہ مرد اور عورت، آقا اور نوکر سب کے سب رات کو اُٹھتے ہیں اور رات کو کھانا پکاتے ہیں اور رات کو ہی کھانا کھا لیتے ہیں۔ بچے سمجھتے ہیں کہ شاید ایسا کرنے میں کوئی خاص لذت اور خاص مزا ہے جس سے مجھے گھر والے محروم کر رہے ہیں اور مجھے وہ مزا نہیں لینے دیتے۔ اگر انہیں روزے سے منع کیا جائے تو رونے لگیں گے اور روزے کے لئے سحری کے وقت ضرور جاگ اُٹھیں گے اور بڑوں کے ساتھ سحری ضرور کھائیں گے اور پھر روزہ رکھنے پر اصرار کریں گے۔ پس جماعتی عبادت ایک تماشہ بن جاتی ہے اور چھوٹے بڑے سب اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ایک مقولہ مشہور ہے کہ مرگِ انبوہ جشن دارد۔ اگر کوئی شخص دیکھے کہ پچاس جنازے جا رہے ہیں اور ہر ایک جنازہ کے ساتھ پچاس ساٹھ یا سَو آدمی ہیں تو ایسے نظارہ کو دیکھ کر وہ اموات کو بھول جاتا ہے اور اس کی نظر اس طرف چلی جاتی ہے کہ یہ

نظارہ کیسا ہے۔ جس طرح جشن کی موت اپنے اندر ایک نظارے کا سامان رکھتی ہے اسی طرح بچوں کے لئے یہ اجتماعی عبادت بھی ایک تماشہ کا رنگ رکھتی ہے اور وہ ماں باپ کی نقل کرتے ہیں اور ماں باپ کے دلوں میں ان کے لئے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ یہ کمزور ہو جائیں گے۔ اگر ان کے دلوں میں ایمان ہو تو یقینی طور پر ان کے دلوں میں غریبوں کے بچوں کے لئے ضرور یہ احساس پیدا ہو گا کہ ہمیں ان کی کمزوری کا بھی احساس کرنا چاہئے۔

اِس بات کا ثبوت کہ ان کو ضرور غرباء کی تکالیف کا بھی احساس ہو جاتا ہے یہ ہے کہ اسلام سب سے پہلا مذہب ہے جس نے راشن سسٹم (Ration-System) جاری کیا ہے اور اسلام پہلا مذہب ہے جس نے رعایا کے کھانے اور رہائش کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہرایا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جس رنگ میں اسلام نے روزے رکھنے کا حکم دیا ہے کسی اَور مذہب میں اس رنگ میں حکم نہیں پایا جاتا۔ جس قسم کا فاقہ اسلام میں کیا جاتا ہے کسی اَور مذہب میں نہیں کیا جاتا۔ اسلام نے اپنے ابتدائی ایام سے ہی راشننگ کو جاری کر دیا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہر مسلمان کے کھانے اور رہائش کی ذمہ دار حکومت تھی۔

بعض نادان ایسے موقع پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے ہی کیوں راشن کا طریق جاری نہ ہوا؟ یہ نادان نہیں جانتے کہ راشن کا طریق جاری کرنا سرمایہ دار حکومت کا کام ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک تو حکومت کے پاس کوئی سرمایہ ہی نہ تھا۔ اس لئے اس وقت تک راشن کا طریق ہی جاری نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن بعد میں جب فراخی کے سامان پیدا ہو گئے اور غیر ملک عرب کی حکومت کے تابع ہو گئے اور روپیہ اور غلہ کی فراوانی ہوئی تب حکومت اِس قابل ہو گئی کہ وہ راشن کے طریق کو جاری کر سکے۔ پس حضرت عمرؓ نے یہ طریق جاری کر دیا۔ بات یہ ہے کہ راشن اُس وقت مقرر کیا جا سکتا ہے جب ملک کے پاس ہر ایک کو غذا دینے کا سامان ہو یا پھر خاص قحط اور جنگوں کی مجبوریوں کے وقت اِس کا انتظام کیا جاتا ہے جیسا کہ اِس زمانہ میں جنگ کی وجہ سے تمام ملکوں میں راشن سسٹم جاری کیا گیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چونکہ حکومت کے پاس کافی سرمایہ یا غلہ نہ تھا؟ آپ نے عام طور پر راشننگ کا طریق جاری نہیں کیا لیکن تنگی کی خاص حالتوں میں آپ نے بھی اِس طریق کو جاری کیا ہے۔

چنانچہ ایک جنگ کا واقعہ ہے کہ آپ کو معلوم ہوا کہ صحابہؓ کے پاس خور و نوش کا سامان کم ہے اور ممکن ہے کہ بعض بالکل بھوکے رہیں تو آپ نے حکم دیا کہ جس کے پاس جو کچھ ہے وہ لے آئے۔ جب سب چیزیں جمع کر دی گئیں تو آپ نے غلہ، کھجوریں اور ستّو وغیرہ سب میں برابر برابر تقسیم کر دیئے 6 اور یہی طریق راشننگ کا طریق ہے جو طریق آپ کے لئے ممکن تھا اس پر آپؐ نے عمل کیا اور جو طریق وسعتِ مالی چاہتا تھا وہ وسعت مالی حاصل ہونے پر حضرت عمرؓ نے جاری کر دیا اور حکم دیا کہ جب بچہ پیدا ہو اسی وقت سے اس کی غذا کا انتظام کیا جائے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ساری اسلامی مملکت میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو یہ جانتا ہو کہ فاقہ کیا چیز ہے۔ ہر ایک کے لئے غلہ مقرر تھا اور ہر ایک کو غذا مل جاتی تھی۔ اِس طریق کی طرف کس نے ہدایت دی؟ یقیناً روزوں نے۔ روزوں نے مسلمانوں کے دلوں میں غریبوں کی ہمدردی کا احساس پیدا کیا اور انہوں نے قرآنی تعلیم پر غور کر کے سب کے لئے خوراک ولباس کے انتظام کا گُر معلوم کر لیا۔ اور اس کے مطابق سارے ملک میں احکام جاری کر دیئے۔ اس انتظام کی وجہ سے تمام اسلامی مملکت میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو یہ جانتا ہو کہ فاقہ کیا چیز ہے۔ لیکن آج کوئی ایک گاؤں بھی ایسا نہ ملے گا جس میں کچھ لوگ یہ نہ جانتے ہوں کہ فاقہ کیا چیز ہے؟ کتنا بڑا فرق ہے جو اسلامی حکومت میں اور آجکل کی حکومتوں میں ہے۔ اسلامی حکومت میں ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق غذا مل جاتی تھی کیونکہ اگر غذا نہ ملے تو انسان کام نہیں کر سکتا اور اگر کام نہ کرے تو وہ قوم کے لئے مفید وجود ثابت نہیں ہو سکتا۔ پس اسلام کی اجتماعی اور انفرادی عبادات سب کی سب اپنے اندر بہت ہی حکمتیں رکھتی ہیں۔ لیکن بہت کم لوگ ان حکمتوں کے متعلق سوچتے ہیں اور ان عبادات سے پورے طور پر فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے فائدہ کے لئے اس میں عادت کا مادہ پیدا کیا ہے لیکن انسان بجائے اس سے فائدہ اٹھانے کے اپنی کمزوری کی وجہ سے اندھا دھند کام کرنے لگ جاتا ہے اور عادت اس کے ذہن سے اس فعل کی حکمتوں کو نکال دیتی ہے اور بغیر سوچے سمجھے ہی عادت کے ماتحت کام کئے جاتا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ یہ کام مَیں کیوں کر رہا ہوں۔ حالانکہ عادت دوسری چیز ہے اور پہلا مقام سوچ بچار کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں عادت کا مادہ اس لئے

رکھا ہے کہ تا جب وہ سوچ بچار کر کے ایک عمل کرنے کا فیصلہ کرے تو پھر عادت سے وہ کام اس کے لئے آسان ہو جائے اور کم سے کم وقت میں وہ اسے بجالائے۔ اگر عادت کا مادہ نہ ہوتا اور ہر دفعہ ہر عمل کے وقت سوچ اور فکر سے کام لیتا تو بہت ہی تھوڑا کام کر سکتا اور اس کی طبیعت پر بے حد بوجھ ہوتا۔ اس نقصان سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان میں عادت پیدا کر دی ہے تا وہ متواتر کام کرتا چلا جائے اور اسے ہر کام کے لئے نئے سرے سے جدوجہد نہیں کرنی پڑتی۔ اور آپ ہی آپ طبعی طور پر اس سے افعال صادر ہوتے جاتے ہیں۔ اگر ہر دفعہ کسی کام سے پہلے ہم سوچا کریں کہ ہم نے یہ کام کرنا ہے پھر یہ سوچیں کیوں کرنا ہے تو یہ کام بہت مشکل ہوتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کی یہ عادت بنا دی ہے کہ وہ افعال کی نوعیت کے متعلق سوچتا ہے اور ان کے نفع و نقصان کے متعلق فیصلہ کرتا ہے۔ پھر وہ اُن کاموں کو عادت کے طور پر بغیر کسی خاص جدوجہد کے سرانجام دیتا چلا جاتا ہے۔ پس عادت نے بہت بڑا فائدہ انسان کو پہنچایا ہے۔ بشرطیکہ ان افعال کی حکمتیں اس کے ذہن سے نہ نکلیں اور غور و فکر کا مادہ اس میں قائم رہے۔ لیکن اس وقت حالت یہ ہے کہ غور و فکر جو اصل چیز تھی اس کو لوگوں نے عادت کا غلام بنا دیا ہے۔ بجائے اس کے کہ عادت تابع ہو فکر اور تدبر کے، تدبر اور فکر کو عادت کے تابع کر دیا ہے۔ انگریزی میں ایک مثال ہے کہ گھوڑا پیچھے گاڑی آگے۔ انسان کے لئے پہلا مقام غور و فکر کا ہے اور دوسرا مقام عادت کا ہے۔ لیکن اب لوگوں نے عادت کو پہلا مقام اور غور و فکر کو دوسرا مقام دے دیا۔ اگر ان سے کسی کام کی حکمت کے متعلق پوچھا جائے کہ آپ لوگ یہ کام کیوں کرتے ہیں؟ تو کہہ دیتے ہیں ہمیں تو معلوم نہیں۔ ہمارے باپ دادے ایسا کرتے تھے اِس لئے ہم بھی ایسا کرتے ہیں۔

جب مَیں حج کے لئے گیا تو ہمارے ساتھ ایک سیدھے سادے آدمی تھے۔ نانا جان مرحوم ان کو اپنے ساتھ حج کے لئے لے گئے تھے۔ اُن کا نام عبد الوہاب تھا۔ ایک دن ہم جدّے میں بیٹھے ہوئے تھے تو مَیں نے ان سے پوچھا کہ آپ کا مذہب کیا ہے؟ کہنے لگے میرا مذہب؟ مَیں نے کہا ہاں آپ کا مذہب۔ مَیں سمجھا کہ وہ کوئی جواب دیں گے لیکن وہ خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر رُکنے کے بعد مَیں نے دوبارہ کہا کہ مَیں نے آپ سے پوچھا ہے کہ آپ کا

مذہب کیا ہے؟ تو کہنے لگے آپ اِتنی جلدی کیوں کرتے ہیں؟ ذرا سوچ لینے دیں۔ مَیں نے کہا آپ گھر سے حج کرنے کے لئے آئے ہیں اور آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کا مذہب کیا ہے؟ میرا مطلب یہ تھا کہ آپ حنفی ہیں یا شافعی ہیں یا اہل حدیث ہیں۔ میرے سوال پر پھر وہ کہنے لگے آپ اِتنی جلدی کیوں کرتے ہیں؟ سوچ تو لینے دیں۔ مَیں نے کہا۔ مذہب تو سوچی ہوئی چیز ہے۔ کچھ دیر کے بعد کہنے لگے کہ مَیں وطن جا کر اپنے مُلّا سے لکھوا کر آپ کو بھجوا دوں گا۔ مَیں نے کہا۔ مَیں آپ کا مذہب پوچھ رہا ہوں آپ کے ملّا کا مذہب نہیں پوچھ رہا۔ تو جس طرح کوئی انسان چِڑ جاتا ہے اسی طرح انہوں نے چِڑ کر کہا کہ آپ اتنی جلدی کیوں کرتے ہیں؟ مجھے سوچ تو لینے دیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگے۔ میرا مذہب ہے عَلَیْه۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ میرا مذہب امام ابو حنیفہ رَحْمَةُ اللهِ عَلَيْه کا مذہب ہے۔ باقی تو وہ کہہ نہ سکے اور صرف عَلَیْه کہہ دیا۔ مَیں نے کہا عَلَیْه تو کوئی مذہب نہیں۔ پھر کہنے لگے۔ اچھا سوچ تو لینے دیں۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگے میرا مذہب ہے امام عَلَیْه۔ اسی طرح آگے پیچھے کر کے ایک ایک ٹکڑا ملاتے گئے مگر امام ابو حنیفہ رَحْمَةُ اللهِ عَلَيْه نہ کہہ سکے۔ پھر مَیں نے ان سے پوچھا۔ اچھا آپ یہ تو بتایئے کہ آپ کو حج کرنے کی کیا سُوجھی؟ کہنے لگے۔ مَیں نے کیا حج کرنا تھا۔ میرے بیٹے کہیں سے سن کر آئے کہ فلاں کے باپ نے حج کیا ہے تو میرے بیٹوں نے مجھے مجبور کیا کہ جا کے حج کر کے آؤ۔ اس لئے مَیں حج کرنے کے لئے آ گیا ہوں۔ اب یہ بھی عادت پہلے، فکر پیچھے والی مثال ہے۔ مَیں نے اُن سے پوچھا تو اُن کو فکر لاحق ہوئی اور وہ سوچنے لگے کہ میرا مذہب کیا ہے۔ اسی طرح بہت سے لوگ ایسے ہیں جو نماز اور روزہ بھی بطور عادت کے کرتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی پوچھے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو ان کو فکر لاحق ہوتی ہے ورنہ اندھا دھند عادت کے ماتحت کام کرتے چلے جاتے ہیں۔

بیسیوں غیر احمدی نوجوانوں سے مَیں نے رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی صداقت کا ثبوت پوچھا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ بس آپؐ سچے تھے۔ مَیں نے کہا اس سے تو ہمیں بھی انکار نہیں اور نہ ہی کسی مسلمان کو اس سے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن آخر کوئی دلیل بھی تو ہونی چاہئے۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے اور انہوں نے تسلیم کیا کہ ہم نے کبھی اس کے متعلق غور نہیں کیا۔ ایسے لوگوں کو

کچھ معلوم نہیں کہ قرآن کریم کیوں سچا ہے حالانکہ ان میں سے کئی ایسے ہوں گے جو رسول کریم ﷺ کی محبت میں جان تک دینے سے دریغ نہ کریں گے۔ لیکن ان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آپؐ کی سچائی کی دلیل کیا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے عادت کو پہلے اور غور و فکر کو پیچھے کر دیا ہے۔ لیکن مومن کی نگاہ ایسی نہیں ہوتی کہ وہ فکر کو عادت کے تابع کر دے۔

اب رمضان ختم ہو رہا ہے جتنے دن باقی ہیں ان میں بہت دعائیں کرو۔ اور اگر پہلے کوئی سُستی تھی تو اسے ترک کر دو۔ لیکن یاد رکھو کہ دعا بھی بعض لوگ عادت کے طور پر کرتے ہیں اور اس بات کو نہیں سوچتے کہ ہماری ضرورت کیا ہے۔ جس چیز کی ہمیں ضرورت ہے ہم اللہ تعالیٰ سے وہ مانگیں۔ بعض کا ہاتھ مالی لحاظ سے تنگ ہوتا ہے، بعض میں اخلاقی کمزوریاں ہوتی ہیں، بعض کی علمی قابلیت کم ہوتی ہے، بعض کی صحت خراب ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر ایک کی ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ جب انسان دعا کرنے سے پہلے سوچے گا کہ مجھے کیا دعا مانگنی چاہئے تو اسے اپنی تمام کمزوریوں کا علم ہو جائے گا۔ اور جب اسے اپنی کمزوریوں کا علم ہو جائے گا تو یقینی بات ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے حضور بہت رقّت اور درد کے ساتھ دعا کرے گا۔ اور دوسرے خود بھی کوشش کرے گا کہ یہ کمزوریاں مجھ میں نہ رہیں اور ان کے مقابلہ کے لئے تیار ہو جائے گا۔ اگر اس طرح سوچ سمجھ کر دعا کی جائے تو اس کا ایک فائدہ تو یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اس دعا کو جلدی قبول فرمائے گا۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ اس کے نفس کو اپنی ضرورتوں کے معلوم کرنے کی عادت پڑے گی۔

اصل میں دعا نفس کا محاسبہ ہے بشرطیکہ کوئی سچے طور پر دعا مانگے۔ لیکن عام طور پر لوگوں نے بعض فقرات یاد کئے ہوتے ہیں۔ ہر دعا کے وقت وہی فقرے دہرا دیتے ہیں۔ مَیں نے دیکھا ہے عام طور پر لوگ دعا کے وقت یہ فقرہ بہت کہتے ہیں۔ اے خدا! تُو ہماری دنیا بھی درست کر دے اور دین بھی درست کر دے۔ دنیا کی درستی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو تنگدستی سے بچالے اور ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اندر مال بھرا پڑا ہوتا ہے اور وہ یہ نہیں سمجھتے کہ دنیا تو میرے پاس موجود ہے مجھے اس کے مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایسے شخص کی دنیا کی درستی تو یہ ہے کہ اس کے پاس سے وہ مال خدا کی راہ میں خرچ ہو اور اس کے لئے ثواب اور نیکی کا

موجب بنے۔ نہ یہ کہ اور مال اس کو حاصل ہو۔ جو کمرہ سامان سے بھرا ہوا ہو اُس کی درستی یہ ہے کہ اس میں سے کچھ سامان نکال لیا جائے، نہ یہ کہ اس میں کچھ اَور سامان ڈال دیا جائے۔ یہ دعا ایک عادت کے ماتحت کی جاتی ہے۔ کسی غریب آدمی کو دعا کرتے سنا کہ اے خدا! تُو میری دنیا کی درستی کر دے اور مجھے مال میں فراخی بخش۔ بس اُس سے سن کر بغیر غور کئے دعا کرنی شروع کر دی۔ دعا کا یہ طریق نہیں ہے۔ بلکہ دعا کا طریق یہ ہے کہ انسان دعا کرنے سے پہلے سوچے اور غور کرے کہ میری کیا کیا ضرورتیں ہیں۔ اس کے بعد وہ خدا تعالیٰ کے سامنے اپنی ضرورتوں کو رکھے۔ یہ دعا اصل دعا ہو گی کیونکہ جب اسے اپنی کمزوریوں اور اپنی ضرورتوں کا احساس ہو جائے گا تو وہ ضرور ان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ سجدہ کرنے سے پہلے ہی اس کی اصلاح ہو جائے۔ کیونکہ حقیقی احساس بھی کمزوریوں کے دور کرنے کا ایک بہت بڑا علاج ہے۔ پھر ہر زمانہ کے کچھ عیب ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنے زمانہ کے عیبوں کے متعلق سوچ بچار کر کے دعا کرنی چاہئے۔ صرف اتنا کہنے سے کہ اے خدا! رحم کر۔ اے خدا! رحم کر۔ رحم نہیں ہوتا جب تک وہ ضرورت مد نظر نہ ہو جس کے لئے رحم طلب کیا گیا ہے۔

اس زمانہ میں ہندوستان کے لوگوں میں ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ ان کے نزدیک ذہن کی کوئی قیمت نہیں جو چیز زیادہ سے زیادہ اُن کے سامنے آتی ہے وہ اسی کے عادی ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ کسی بات کے متعلق سوچ بچار کر کے اس کے غلط یا صحیح ہونے کا اندازہ لگا سکیں اور ذہن کو بالکل عضوِ معطّل کی طرح چھوڑا ہوا ہے حالانکہ ذہن ایسی چیز ہے کہ اگر اسکے بڑھانے کی کوشش کی جائے تو وہ بڑھ سکتا ہے۔ لیکن ہمارے لوگوں کی نظر روزہ مرہ کے کاموں سے آگے تجاوز ہی نہیں کرتی۔ داناؤں کا قول ہے کہ ایک ضرورت پیش آئے تو دس اَور متعلقہ ضرورتوں کو بھی مد نظر رکھنا چاہئے۔ لیکن آجکل حالت یہ ہے کہ بالکل بے سوچے سمجھے سیدھا چلتے چلے جاتے اور اپنے دائیں بائیں ماحول کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں منافقوں کے متعلق فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نشان پر نشان اسلام کی صداقت کے لئے ظاہر ہو رہے ہیں لیکن یہ لوگ سوٌروں کی طرح سیدھے ایک سمت میں چلتے چلے جاتے ہیں اور اپنے ارد گرد کے حالات کو نہیں دیکھتے۔ ذہین آدمی کا کام ہے کہ اس کا منہ خواہ کسی طرف

پھیر دو اور اس کے سپرد خواہ کوئی کام کرو وہ اپنے ارد گرد کے حالات کا خوب مطالعہ کرے گا اوران کے متعلق چوکس اور چوکنّا رہے گا۔ اور اس کی باتوں میں معقولیت کا رنگ ہو گا۔ لیکن غیر ذہین اور غافل آدمی بعض دفعہ ایسی بات کرتا ہے جو اس کی ذلّت اور رُسوائی کا موجب ہوتی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک بزرگ کا قصہ سنایا کرتے تھے۔ دراصل بزرگ تو نہیں لیکن بزرگ بن بیٹھا تھا۔ اُس علاقہ کے بادشاہ کو اس کے وزراء نے مشورہ دیا کہ اس کے پاس دعا کرانے کے لئے چلنا چاہئے۔ چنانچہ بادشاہ ان کے مشورہ کے مطابق اس بزرگ کو ملنے کے لئے گیا۔ جب اس بزرگ سے باتیں شروع ہوئیں تو اس بزرگ نے اپنے دل میں خیال کیا کہ بادشاہ سے اس قسم کی باتیں کروں جن سے بادشاہ پر رُعب پڑے۔ چنانچہ اس نے کہنا شرع کیا۔ اے بادشاہ! اپنی رعایا سے انصاف کرنا چاہئے اور تمہیں دوسرے مسلمان بادشاہوں پر سبقت لے جانی چاہئے۔ تم سے پہلے ایک مسلمان بادشاہ سکندر ذوالقرنین گزرا ہے وہ بہت انصاف کرنے والا تھا۔ مسلمان بادشاہوں کو دوسرے علموں کے متعلق بے شک ناواقفیت ہو گی لیکن وہ تاریخ کا علم ضرور رکھتے تھے کیونکہ اُنہیں پہلی حکومتوں کے حالات سے کسی حد تک سبق لینا ہوتا تھا۔ اور ان کے نظام کے حُسن و قبح پر نظر رکھنی ہوتی تھی۔ جب اس نے یہ کہا کہ سکندر ذوالقرنین ایک مسلمان بادشاہ تھا تو بادشاہ کو اس کی بزرگی کا اندازہ ہو گیا۔ بادشاہ وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے وزراء سے کہنے لگا کہ یہ تو نہایت جاہل شخص ہے۔ اگر یہ تاریخ کے متعلق نہیں جانتا تھا تو اسے میرے سامنے تاریخ بھگارنے کی ضرورت کیا تھی۔ اب یہ اُس (بزرگ) کی بیوقوفی تھی کہ اس نے ایک ایسا رستہ اختیار کیا جس کے متعلق اُسے علم نہ تھا۔ اگر وہ ذہین ہوتا تو بجائے ایسی باتوں کے کوئی اَور نصیحت کرتا۔

پس ذہن کی تیزی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کے لئے ہر عمر میں مشعلِ راہ ہوتی ہے۔ ذہین آدمی دینی معاملات کو بھی بہت جلد سمجھ لیتا ہے اور دنیوی معاملات کو بھی بہت جلد سمجھ لیتا ہے۔ مثلاً ایک ذہین آدمی آجکل اخباروں کو ضرور پڑھے گا تاکہ اُسے یہ معلوم ہوتا رہے کہ اُس کی قوم کو کس کس قسم کی مشکلات پیش آ رہی ہیں اور اسے کس قسم کی تیاری کرنی چاہئے۔ لیکن باوجود اس نازک زمانہ کے تمہیں ہزاروں ہزار نوجوان ایسے ملیں گے جو گپیں ہانکتے رہیں گے

لیکن اخبار کا مطالعہ نہیں کریں گے اور اپنی قوم کی بہتری اور فائدہ کے لئے کوئی کوشش نہیں کریں گے۔ ان کے دماغ پراگندہ ہو گئے ہیں اور ذہن مُردہ ہو گئے ہیں اور ان کو قومی خوبیاں یا قومی نقائص نظر ہی نہیں آتے۔ پس ایک مومن کو چاہیئے کہ وہ بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور یہ دعا کرے کہ یااللہ! رحم کر، یااللہ! رحم کر۔ اپنی ذہنی حالت، اپنی علمی حالت اور اپنی ضرورتوں کا بغور مطالعہ کرے اور پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ اے خدا! تُو میرے ذہن میں جِلا پیدا کر دے۔ یاالٰہی! تُو میرے دماغ میں وسعت پیدا کر دے کہ وہ باریک سے باریک مضامین کو اخذ کر سکے۔ یاالٰہی! تُو مجھے دینی مسائل سمجھنے کی توفیق عطا فرما اور تقویٰ کی باریک راہیں مجھ پر کھول دے۔ ایسی دعا صرف دعا ہی نہیں ہو گی بلکہ وہ ایک مدرسہ ہو گی جس میں اس کے ذہن اور عقل کی تیزی کے سامان ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کا اس دعا کو قبول کرنا ایک زائد بات ہو گی۔

مَیں نے ذہانت کے متعلق بتاتے ہوئے ایک بزرگ کی مثال دی ہے لیکن اس سے بڑھ کر ایک تازہ مثال مجھے یاد آئی ہے۔ مَیں نے پچھلے خطبہ میں انڈونیشیا کی ہمدردی کی طرف جماعت کو توجہ دلائی تھی۔ جب وہ خطبہ میرے پاس نظر ثانی کے لئے آیا تو مجھے اس کو پڑھ کر بہت افسوس ہوا ہے کہ ہماری جماعت دوسری تمام جماعتوں سے تعلیمی معیار کے لحاظ سے اول نمبر پر ہے اور ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے دنیا کو فتح کرنا ہے لیکن مجھے سخت حیرت ہوئی کہ خطبہ نویس مولوی فاضل ہے اور جامعہ احمدیہ کا پاس شدہ ہے۔ اس نے خطبہ میں میری طرف یہ منسوب کیا ہے کہ گویا مَیں نے کہا تھا کہ انڈونیشیا میں فرانسیسی حکومت ہے۔ ہمارے مبلغ انڈونیشیا میں ہیں اور تبلیغی رپورٹیں چھپتی رہتی ہیں لیکن اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ انڈونیشیا میں کونسی حکومت ہے۔ ہمارے مبلغ وہاں بیس سال سے کام کر رہے ہیں۔ اگر مبلغ نہ بھی ہوتے تو بھی میرا خدا کے فضل سے مطالعہ اِتنا وسیع ہے کہ مَیں اس قسم کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اسے صحیح طور پر علم نہیں تھا تو اگر اس میں غور کرنے کا مادہ ہوتا تو وہ فوراً کسی سے پوچھ لیتا یا اخبار کی طرف توجہ کرتا۔ اگر اسے پہلے علم نہ تھا تو اسے میرے منہ سے سن کر ہی یاد رکھ لینا چاہیئے تھا کہ وہاں ڈچ حکومت ہے یا فرانسیسی حکومت ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اکثر

جگہ ڈچ کا لفظ لکھ کر پھر کاٹا ہوا ہے اور اس کی جگہ فرانسیسی حکومت لکھا ہوا ہے۔ اس نیک بخت کو اِتنی بھی توفیق نہیں ملی کہ اخبار ہی پڑھ لیتا۔ معلوم نہیں لکھتے وقت اس کا دل کس فکر میں تھا۔ بس ایک ہی فکر ایسے لوگوں کو رہتا ہے کہ شام کو کیا کھانا ہے اور صبح کو کیا کھانا ہے۔ ایک اَور مضحکہ خیز بات لکھی ہے۔ مَیں نے تو کہا تھا کہ اسلامی ممالک کو ایک دوسرے سے ہمدردی نہیں گو اَب بین الاقوامی اتحاد کے لئے وہ عرب لیگ میں شامل ہو گئے ہیں لیکن ان میں سے کوئی ملک یہ نہیں چاہتا کہ وہ دوسرے ملک کے تابع اور ماتحت ہو۔ شام یہ نہیں چاہتا کہ وہ مصر کے ماتحت ہو اور مصر یہ نہیں چاہتا کہ وہ شام کے ماتحت ہو۔ فلسطین اس بات کے لئے تیار نہیں کہ وہ شام کے ماتحت رہے اور شام اس بات کے لئے تیار نہیں کہ وہ فلسطین کے ساتھ مل کر رہے۔ ایک مسلمان حکومت ٹرکی کی ہے وہ بھی ایک عرصے سے عربوں سے دلچسپی نہیں رکھتی۔ بے شک پہلے عرب کا علاقہ ٹرکی کے ماتحت تھا لیکن جب سے عرب نے آزادی حاصل کی ہے اس وقت سے ٹرکی کو عرب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔ مَیں نے تو یہ کہا تھا لیکن خطبہ لکھنے والے نے لکھ دیا کہ مَیں نے کہا تھا کہ ایک ہزار سال پہلے ٹرکی کو عرب سے دلچسپی تھی۔ ایک ہزار سال سے ٹرکی کو عرب سے کوئی دلچسپی نہیں رہی یعنی ایک ہزار سال پہلے تو عرب حکومت اور ٹرکی کے تعلقات اچھے تھے۔ اب ایک ہزار سال سے وہ تعلقات منقطع ہو گئے ہیں۔ خطبہ لکھنے والے کو اتنا بھی علم نہیں کہ ٹرکی کی حکومت کو قائم ہوئے چھ سو سال ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے وہاں پر عیسائی حکومت تھی۔ تو ایک ہزار سال پہلے کس طرح اس حکومت کے تعلقات عربوں سے اچھے تھے۔ اِس سے زیادہ جہالت اور کیا ہو سکتی ہے۔ بس اُس کا علم فَعَلَ فَعَلَا فَعَلُوْا پر آ کر ختم ہو گیا ہے اور اُسے ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ وہ حکومتوں کے حالات اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرے۔ ایک بات میری طرف خطبہ میں یہ منسوب کی ہے کہ شمالی افریقہ کے مسلمان بالکل جاہل ہیں۔ وہ اسلامی دنیا کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ حالانکہ مَیں نے مغربی افریقہ کہا تھا۔ شمالی افریقہ کا ملک تو مصر ہے جو علم میں بہت بڑھا ہوا ہے اور ساری اسلامی دنیا سے زیادہ بیدار ملک ہے۔ یہ خطبہ نویس مولوی صاحب تو وہاں کے علماء سے سالہاسال پڑھ کر بھی شاگردی کے مقام سے آگے نہیں نکل سکتے۔

پس دعا کے لئے سب سے ضروری امر یہ ہے کہ انسان اپنی کمزوریوں اور اپنی ضرورتوں کو اپنے سامنے لائے اور اُن کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرے۔ یہ دعا ایسی ہو گی جو اسے فائدہ پہنچائے گی اور اُس کے لئے کامیابی کے رستے کھول دے گی۔ ورنہ یونہی یا اللہ! رحم کر۔ یا اللہ! رحم کر کہتے جانا انسان کی فلاح اور کامیابی کا موجب نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو شخص اپنی کمزوریوں کا ندامت کے ساتھ احساس کرے گا اور اپنی حقیقی ضرورتوں اور اپنی جہالت اور کم علمی کا احساس کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے آستانہ پر گرے گا وہ جاہل ہونے کی حالت میں رمضان میں داخل ہو گا اور عالم بن کر رمضان سے نکلے گا۔ تو اِن چیزوں میں انسان کی اپنی ذاتی قابلیتوں اور استعدادوں کا بھی دخل ہوتا ہے۔ لیکن بہر حال ایسی دعائیں کرنے والا شخص پہلے کی نسبت بہت آگے نکل جائے گا۔

ہر شخص سے خدا تعالیٰ کا الگ الگ معاملہ ہوتا ہے۔ میرے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے وہ ہر شخص سے نہیں ہو سکتا۔ مَیں نے دیکھا ہے مختلف علوم جن سے مجھے دلچسپی ہے وہ سب کے سب خدا تعالیٰ نے مجھے سکھائے ہیں اور ان دنیاوی علوم کے متعلق بڑی محنت سے تحقیقات کر کے جن لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں جب مَیں اُن کتابوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے اُن کی کتابیں پڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابھی ابتدائی مسائل بیان کر رہے ہیں۔ ہاں جن علوم سے مجھے دلچسپی نہیں وہ مجھے بالکل نہیں آتے۔ مثلاً کوئی کہے کہ تمہیں باجا بجانا آتا ہے؟ تو مَیں کہوں گا نہیں۔ کیونکہ مجھے اس سے کسی قسم کی دلچسپی نہیں۔ پس جو سلوک اللہ تعالیٰ کا میرے ساتھ ہے وہ ہر ایک کے ساتھ نہیں۔ عام طور پر انسان کوشش کر کے ہی کسی چیز کو حاصل کرتا ہے۔ یہ اس کا محض فضل ہے کہ ایک شخص جو ظاہری لحاظ سے اس سلوک کا مستحق نظر نہیں آتا وہ اس پر اپنا فضل نازل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عام قانون بھی ہے کہ انسان کوشش کرے تو وہ مطلوبہ چیز کو حاصل کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہو جاتا ہے۔ سقراط اور ارسطو نے فلسفے وغیرہ کے جو اصول مقرر کئے ہیں وہ سب ان کی سوچ بچار کا نتیجہ ہیں اور ان کی ذہنی کوشش کا پھل ہیں۔ پس سوچ سمجھ کر دعائیں کرو اور اپنی قوم کی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر اور ان کا احساس کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری دعاؤں کو سنے گا اور رمضان کا

مہینہ تمہارا اُستاد بن جائے گا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سوچ بچار کرنے سے تم اپنے استاد آپ بن جاؤ گے۔

بعض لوگ مجھے کہتے ہیں کہ ہمیں کوئی دعا سکھا دیں۔ مَیں اُنہیں جواب دیا کرتا ہوں کہ سورۃ فاتحہ ہی سب سے بڑی دعا ہے۔ وہ تمہیں آتی ہے تو پھر تمہیں کسی اَور دعا کے سیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ دوسروں کے دعائیں سکھانے سے کچھ نہیں بنتا۔ اصل دعا وہ ہے جو انسان کے اندر سے آپ پیدا ہوتی ہے۔ یہ صاف بات ہے کہ جو درد اندر سے پیدا نہ ہو دوسرے لوگوں کے کہنے سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور دعا کی قبولیت کے لئے سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ اس کے ساتھ رقت اور سوز و گداز ہو۔ جتنا سوز و گداز زیادہ ہو گا اتنی ہی دعا قبولیت کا رنگ اختیار کرے گی۔ کسی نے کہا ہے "جو منگے سو مر رہے مرے سو منگن جا۔" جو مرتے نہیں اُن کی دعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں۔ صرف منہ سے کہہ دینے سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا جب تک اُس دعا کے ساتھ پُر درد جذبات نہ ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیم اور مظلوم کی دعا کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ عرشِ الٰہی کو ہِلا دیتی ہیں۔7 اُنہیں کوئی لمبی لمبی دعائیں کرنے کی ضرورت نہیں اُن کی ایک آہ ہی عرش کو ہلانے کے لئے کافی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ درد کے جذبات سے پُر ہوتی ہے۔ اور وہ اس بادل کی طرح ہوتی ہے جو پانی سے پُر ہوتے ہیں اور اپنے پانی سے زمین کا چپہ چپہ گیلا کر دیتے ہیں۔ اور جو دعا جذباتِ درد سے خالی ہے وہ سُوکھے بادل کی طرح ہے کہ جس میں پانی کا ایک قطرہ نہیں ہوتا۔ صرف اس کے ساتھ آندھی ہوتی ہے اور بسا اوقات وہ گھروں کی چھتوں کو اُڑا کر لے جاتا ہے۔

پس تمام احمدی دوستوں کو، اپنے لئے، اپنے ہمسائیوں کے لئے، اپنی جماعت کے لئے، باقی مسلمانوں کے لئے، موجودہ زمانہ کی مشکلات اور اس کے خطرات کو سوچ سوچ کر دعائیں کرنی چاہئیں تا اُن کی دعائیں جذبات کے ماتحت ہوں۔ اور باقی مسلمانوں کو بھی تحریک کرنی چاہئے کہ وہ دعا کی طرف توجہ کریں۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں میں اِس وقت دعا کی اہمیت کا احساس نہیں رہا۔ بیٹھے ہوئے تسبیحیں پھیرتے ہیں لیکن نماز، روزہ اور دعا کی غرض سے ناواقف ہیں۔ اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں قرآن کریم کی محبت کم ہو گئی ہے اور اس کی

تعلیم سے نا آشنا ہو گئے ہیں۔ اِس لئے اب ان کے دلوں میں قرآن کریم اور رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی محبت کو قائم کرنا چاہئے اور اُنہیں اُس تکلیف اور مصیبت کا احساس کرانا چاہئے جو اُن پر پڑنے والی ہے۔ اگر اُن کو اس مصیبت کا احساس ہو جائے اور دردِ دل سے دعاؤں میں لگ جائیں تو یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ خدا جس نے یونس علیہ السلام کی قوم کی دعاؤں کو سن کر اُن سے عذاب کو ٹلا دیا تھا وہ محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اُمت کی دعاؤں کو نہ سنے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

اے دل تُو نیز خاطر ایناں نگاہ دار

کآخر کنند دعویٔ حُبِّ پیمبرم 8

اِس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو سمجھایا ہے کہ دیکھو! یہ مسلمان تمہیں تکلیفیں بھی دیں گے، تمہارے آدمیوں کو قتل بھی کریں گے، تمہیں ہر قسم کے دکھ ان کے ہاتھوں سے پہنچیں گے۔ لیکن دیکھنا! غصے نہ ہونا کہ "آخر کنند دعویٔ حُبِّ پیمبرم" کہ آخر تمہارے محبوب محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے وابستہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا لحاظ ضرور کرنا اور اِن کی سخت باتوں پر خفگی کا اظہار نہ کرنا۔ پس ہماری جماعت کے دوستوں کو دوسرے مسلمانوں کو بھی سمجھانا چاہئے کہ وہ بھی دعاؤں میں لگ جائیں اور دردِ دل سے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کریں کہ وہ ان مصائب کو مسلمانوں سے دور کر دے۔ اور جیسا کہ مَیں نے کہا ہے جماعت کا فرض ہے کہ وہ سمجھ سوچ کر دعائیں کرے اور ایسی دعائیں کرے جو اپنے ساتھ پُر درد جذبات رکھتی ہوں۔ اگر تم دردِ دل سے دعائیں کرو گے تو تمہاری دعا پانی سے پُر بادل کی طرح ہو گی جو زمین پر سیلاب لے آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے عرش کو گیلا کر دے گی اور اس کی رحمت کو عرش سے کھینچ کر لے آئے گی۔"　(الفضل 3 ستمبر 1946ء)

1: تفسیر غرائب القرآن برحاشیہ تفسیر ابن جریر جلد 3 صفحہ 204۔ مطبوعہ مصر

2: صحیح بخاری کتاب الصوم باب من لم یدع قول الزور و العمل به فی الصوم

3: يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ۗ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ (الحجرات: 18)

4: العنکبوت: 46

5: البقرۃ: 184

6: صحیح بخاری کتاب الشِّرْکَة باب الشِّرْکَة فِی الطَّعَامِ وَ النَّھْد (الخ)

7: بخاری کِتَابُ الْمَظَالِم باب اَلْاِتِّقَاء وَ الْحَذْر مِنْ دَعْوَةِ الْمَظْلُوْمِ میں صرف مظلوم کا ذکر ہے۔

8: درثمین فارسی صفحہ 107 مطبوعہ بار اول ضیاء الاسلام پریس ربوہ